میں نے اسحٰق کے سامنے کھڑے دیکھا..... موتیا رنگت، ہلکا زرد لباس، پھیکے پھیکے ہونٹ اور بہت خوبصورت ہاتھ..... اس کے بعد میں نے اس پر نظر ڈالی۔ وہ مجھے پیلی موم کا بت نظر آئی اس کی پلکیں رخساروں سے پیوست تھیں غالباً اس نے میری طرف ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا کمرے میں شام کا اندھیرا چھایا ہوا تھا جس وقت پھوپھی نے پہلا بلب جلایا میں اور صولت بھابھی وہاں سے رخصت ہوئے۔

واپسی پر پتنگ بازار میں سے چلتے ہوئے بھابھی صولت نے پوچھا۔ ''کیسی ہے؟''

''اچھی ہے۔''

''سب سے اچھی بات بتاؤں سخت پردے میں پلی ہے۔ ماموں زاد، چچا زاد پھوپھی زاد بھائیوں سے بھی ملنے کی اجازت نہیں تمہاری طرف بھی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا خوش نصیب ہو قیوم..... ایسی لڑکی اب ان ہی علاقوں میں مل سکتی ہے ورنہ اگر گلبرگ ہیں ڈھونڈتے تو بڑی تیز لڑکی ملتی۔''

میرے دل میں چھوتی سے امید کرن پھوٹی۔

بقول امتل ہر انسان کے اندر ایک چھاٹا سا رب چھپا ہوا ہے جو چاہتا ہے کہ زندگی میں اسے ایک سچا پجاری ایک صادق عبد اور ایک سر ہتھیلی پر رکھنے والا عاشق مل جائے جس وقت اللہ نے حضرت آدم میں اپنی روح پھونکی۔ اسی وقت سے یہ چھوٹا خدا اس بات کا آرزومند ہوا۔ اسی لیے آدم کی خواہش کے احترام میں حضرت حوا وجود میں آئی یہ بات ہے کہ اس کے بعد حضرت آدم اللہ کے سچے عبد نہ رہے لیکن چھوٹا سا رب بننے کی تمنا ان کے ساتھ ہی زمین پر آئی۔

میں بھی کسی پجاری پر اپنی ذات کا مکمل بوجھ ڈال کر آزاد ہونا چاہتا تھا۔ انسان ساری عمر آزادی کی خواہش میں بھٹکتا رہتا ہے یہ اسکی دوسری ایسی خواہش ہے جس

کے اندر تضاد پہلے سے موجود رہتا ہے چونکہ مشیت غالبا آزادی کی خواہاں نہیں اس لیے اس نے روح کو پابند کرنے کے لیے جسم کی بیڑیاں پہنائیں جب بھی روح مکمل طور پر آزاد ہو جانا چاہتی ہے یہی جسم اس کی اڑانوں کو سست رفتار کرتا ہے جب جسم پورے طور پر کھل کھیلنا چاہتا ہے اور ہر جوا تار کر اپنے لیے مکمل آزادی کی کوشش کرتا ہے روح جسم کے اندر کبھی احساس جرم کبھی احساس گناہ تصور خدا کبھی تخیل مابعد کے نامعلوم جال پھیلا کر جسم کو قید کر لیتی ہے بنیادی طور پر شروع سے انسان قید پیدا ہوا ہے اور اس قید سے بھاگنے کی سعی میں دیوانہ اور بھاگتا رہتا ہے شاید ابا کو بھی اسی قید کا شاید احساس تھا کچھ لوگ اسی احساس سے اس قدر بوجھل رہتے ہیں کہ زندگی بھر انہیں نیستی کے سوائے اور کسی چیز سے پیار نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف اسی وقت پر سکون ہوتے ہیں جب نیند یا بیہوشی کا غلبہ ان پر ہو جائے پھر ان کے اندر جسم اور روح کی جنگ وقت طور پر بند ہو جاتی ہے عمر رفتہ میں مجبوس یادیں ان کا کھٹ بگاڑ نہیں سکتیں آنے والے مستقبل کی زنجیریں انہیں پابوس نہیں کر سکتیں اور وہ کچھ دیر کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں بالکل آزاد۔ آزاد کی اسی خواہش نے انسان کو ہمیشہ بے قرار رکھا ہے حالانکہ وہ اندھی اندر جانتا ہے کہ اس کے ضمیر میں ایک بہت بڑا حصہ غلامی کا بھی ہے..... اور وہ مقید رہے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتا..... آگے نہیں بڑھ سکتا جس قدر وہ آزادی کا خواہاں رہتا ہے اسی شدت سے اطاعت غلامی اور انکساری اس کی ذات کے لیے ضروری ہوتی جاتی ہے۔

شادی سے پہلے کنیدن میں ان ہی دو خواہشوں میں پرویا رہا ایک طرف یہ تسلی تھی کہ روشن جس وقت میرے گھر میں داخل ہوئی اس میں اتنی شکتی ہوگی کہ وہ میرے جسم اور روح کا تمام تر بوجھ اپنی محبت کے جیک پر اٹھا لے گی اور سچا پجاری پا کر آئندہ میرے تجربات میرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے میں اپنے آپ میں نہیں اس کے وجود میں زندہ رہنے لگوں گا دوسری طرف مکمل آزادی کی خواہش تھی مجھے لگتا تھا اگر وہ

روزن ثابت نہ ہوسکی تو پھر میں شادی میں محصور ہو جاؤں گا جیسے کبھی کبھی ندی رستہ پا کر ایک گہری جھیل میں جا گرتی ہے اور پھر اس کے پانی نشیب کی تلاش میں نہیں رہتے صرف پاتال کی طرف اترتے جاتے ہیں اندھیرے کی طرف گرم لادے کی طرف۔

شادی سے دو ایک دن پہلے میرے دل دماغ اور جسم بالکل سن ہو گیا۔ سارا دن میری کھوپڑی پر ڈھولک بجتی رہتی نیچے کی رونق سے گو میرا تعلق کم تھا پھر بھی یہ شادی والا گھر تھا اور میں سارا سارا دن اکیلا نہ بیٹھا رہ سکتا تھا جس وقت میں سہرا پہن کر کار میں بیٹھا آخری بار رسہ تڑوا کر آزاد ہونے کی خواہش دل میں جاگی اور جب قبول ہے قبول کے مرحلے سے گزر کر سب طرف چھوہارے اچھلے مبارک مبارک کی صدائیں اٹھیں اس وقت میں نے جانا میرے اندر کے چھوٹے سے رب نے گواہی دی کہ آج مجھے ایک سچا عاشق ملے گا جو میرے بوجھل وجود کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر ڈال لے گا۔ اب اس خواہش کے ساتھ ہی میرے دل میں عجیب قسم کی خوشی بیدار ہوئی ایک خاص قسم کی ecstasy جیسے بہار کے دنوں میں خوشبو سے بوجھل ہوا ہوتی ہے۔

رات گئے تک میں نیچے بھابھی صولت اور بھائی مختات کے مہمانوں میں گھر ابیٹھا رہا کچھ ریڈیو سٹیشن کے ساتھی بھی موجود تھے کچھ آرٹسٹ برادری بھی آن پہنچی تھی۔ ان لوگوں کے بے تکلف لطیفوں نے مجھمیں اور بھی خوش اعتمادی پیدا کر دی اور مجھے ان سلیم شاہی جوتیوں نے کاٹنا بند کر دیا جو میرے پیروں میں کچھ کچھ تنگ تھیں آدھی رات کے قریب میں اوپر گیا ..... یہ وہی کمرہ تھا جہاں عابدہ چائے کی ٹرے اور مونگ پھلیوں کا لفافہ لے کر آیا کرتی تھی اسے بیک وقت مونگ پھلیاں کھانے اور باتیں کرنے کا کس قدر شوق تھا ..... عابدہ کہاں تھی؟ ..... جس نے بچے کی آرزو میں اپنے آپ کو تنتز ایوگا پر آمادہ کیا تھا ..... شاید وہ بھی مہمانوں میں تھی لیکن آج میں

سارا دن اسے پہچاننے سے بھی قاصر رہا۔

کمرے کی صورت پھولاور ہاروں کی وجہ سے بدلی ہوئی تھی ہر جگی نئے سوٹ کیس سرخ کسہری کاغزوں میں لپٹے ہوئے ڈبے پڑے تھے کمرے میں باسی چنبیلی کے پھولوں کے ساتھ ساتھ دلہن کی خوشبو تھی ہم دونوں اکیلے تھے اور شادی شدہ تھے۔..... بڑی آرزوؤں کے ساتھ اور بڑے عہدو پیان کر کے ہم دونوں کو باقی کی زندگی کا سفر کاٹنا تھا۔

''میرا نام قیوم ہے.....'' میں نے پلنگ پر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا..... '' میں نے سوشیالوجی میں ایم اے کیا ہے..... ریڈیو سٹیشن میں ملازم ہوں السر کا مریض ہوں، سالن میں مرچیں نہیں کھا سکتا..... آپ کو اس کی طرف سے احتیاط کرنا ہوگی..... مجھے ایما ے سوشیالوجی کی تعارفی کلاس یاد آ گئی..... کیا انسان ساری عمر اپنا تعارف ہی کراتا رہتا ہے۔''

روشن نے بغیر تکلف کے منہ سے گھونگھٹ اتار دیا..... ایسا زرد سورج مکھی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

میں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنی ساری زندگی آپ کو دوں..... بمع اس کی تلخ یادوں کے..... کیا آپ میں اتنی ہمت ہے کہ آپ میری یادوں کا بوجھ بھی اٹھالیں اپنے دل پر؟..... اور مجھے ہلکا پھلکا کر دیں.....؟ میں نے پوچھا۔

اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھوں سے پیلے رنگ کے آنسو زرد گالوں پر بہنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں اس لیے غالباً وہ میری بات کی تاب نہیں لا سکی میں نے جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھے اس نے مدافعت نہ کی اور چپ رہی۔

''کیا آپ میری تلخیوں کو جذب کر لیں گی؟..... میں اتنا کچھ سہہ چکا ہوں کہ اگر آپ نے وعدہ نہ کیا تو میں بالکل پاگل ہو جاؤں گا..... مینٹل ہسپتال سے مجھے صرف

آپ ہی بچا سکتی ہیں۔"

پہلی بار روشن بولی..... چھوٹی سی کم عمر آواز جیسے کوئی نوعمر کبوتری بولے "اگر آپ نے میری تلخیوں کو جذب نہ کیا تو میں تباہ ہو جاؤں گی پوری طرح..... پوری طرح ..... پوری طرح....."

میرے انداکے مرد نے بیچاری عورت کو سہارا دینے کے لیے کہا..... "تم میرے ہوتے ہوئے تباہ نہیں ہو سکتیں روشن..... تمہاری تمام تلخیوں کو میں جذب کر لوں گا جیسے..... جیسے بارش کو ریت جذب کرتی ہے۔"

ہم دونوں خاموش ہو گئے مجھے لگا جیسے میں ٹاس ہار گیا ہوں میں نے سگریٹ سلگا لیا اور کتنی ہی دیر تک سگریٹ پیتا رہا۔

"پھر.....؟" بڑی دیر بعد میں نے سوال کیا۔

"جی....." وہ اب ہولے ہولے رو رہی تھی اور کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر بتا رہی تھی کہ میں اسے چپ کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

"پھر..... بتاؤ ناں.....؟"

"بتانے والی بات نہیں ہے..... میں اچھی طرح سے بتا بھی نہیں سکتی۔"

"ہم ریڈیو والے بہت کچھ جانتے ہیں ہمارے لیے کچھ نیا نہیں ہوتا، تم بتاؤ تو سہی!....."

دو تین گھنٹوں کے دم دلاسے کے بعد وہ اپنی تلخی کی طرف آئی۔

"جی مجھے بچہ ہونے والا ہے۔"

یکدم مجھے یوں لگا جیسے کوئی بھاری چیز میرے ماتھے سے اندھیرے میں ٹکرائی میں بھنا گیا۔ بظاہر میں نے جرات سے کہا..... "اچھا پھر تو..... پھر..... تو ایک دوسری بات ہے۔"

اب وہ اونچے اونچے رونے لگی..... "میں نے اماں جی سے بہت کہا..... ہاتھ

جوڑے خدا قسم..... بہت منتیں کیں لیکن وہ تو کہتی ہیں میں کسی قصائی کو بیچ دوں گی اس کے ساتھ شادی نہیں کروں گی تیری۔"

"کون ہے وہ؟..... بچے کا باپ؟"

"ہماری گلی میں پتنگوں کی دوکان ہے اس کے باپ کی) پہلے وہ باپ کی دوکان پر بیٹھا کرتا تھا اب..... اب تو وہ جدے چلا گیا..... میرے گھر والوں نے اسے ٹکنے ہی نہیں دیا۔"

"بڑا افسوس ہے....." یہ بات میرے منہ سے بڑی فروعی لگی

"ایک روز وہ فلم دیکھنے گیا تو..... تو میرے بھائیوں نے اسے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے پکڑ لیا کالر سے..... اتنا مارا..... اتنا مارا..... بھلا اسے کیوں مارتے تھے یہ لوگ قیوم صاحب..... قصور تو سارا میرا تھا..... سارا میرا..... اس نے کئی بار میری منتیں کیں ہاتھ جوڑے لیکن..... لیکن میں اسے چھوڑ ہی نہیں سکتی نہ اس زندگی میں نہ....." یکدم وہ میرا چہرہ دیکھ کر چپ ہوگئی۔

"آپ کو میری باتیں بری لگ رہی ہیں؟..... روشن نے اٹک اٹک کر سوال کیا

....."تم نے..... تو پھر تم نے یہ شادی کیوں کی روشن؟..... جب تم اس حد تک بیاہی جا چکی ہو تو اس شادی کی کیا ضرورت تھی؟"

اب اس کی آواز دھیمی پڑ گئی....."مجھے تو ضرورت نہیں تھی جی..... یہ میرے گھر والے اگر اسے جان سے مارنے کی دھمکی نہ دیتے تو..... تو میں کبھی رضامند نہ ہوتی میرا خدا گواہ ہے۔"

اتنے زرد معصوم چہرے پر اتنی وثوق کی باتیں کچھ اوپری معلوم ہو رہی تھیں۔

"اب کیا کریں روشن؟"

وہ چپ ہوگئی پھر چپ چاپ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

"جیسی آپ کی مرضی؟"

''تم جدے خط لکھو کہ..... وہ تمہیں آ کر لے جائے..... میں تمہیں اس کی امانت سمجھوں گا۔''

یکدم اس کی آنسو خشک ہو گئے اور وہ ہکا بکا میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ دیکھتی گئی اس کی آنکھوں میں تحیر خوف کی حد تک منجمند ہو گیا تھا۔

''آپ..... آپ جی؟''

''چاہو تو میں ابھی تمہیں طلاق دے دوں..... چاہو تو اس کی آمد پر..... فیصلہ کر دوں گا.....'' میں نے جیب سے ایک خوبصورت گھڑی نکالی۔ اس گھڑی میں دن وقت مہینہ چاند رات سب کچھ نظر آتا تھا۔ یہ گھڑی میں نے اس امید پر خریدی تھی کہ جس وقت میں یہ گھڑی روشن کی کلائی پر باندھوں گا۔ اس لمحے کے بعد میں اپنی زندگی کا پیٹرن مکمل طور پر بدل دوں گا اس کے بعد میرے وجود کی تمام سوئیاں اس کی تابع چلیں گی اور اس طرح میں اپنے بوجھ سے آزاد ہو جاؤں گا میں نے گھڑی اس کے پاس رکھ کر کہا..... ''وقت دیکھ لو روشن..... اس وقت میں تم سے عہد کرتا ہوں کہ..... کہ تم یہاں مہمان ہو۔ جب تک تمہارے حالات اجازت دیں یہیں رہو اپنے آپ کو میری بیوی ظاہر کرنے میں سہولت ہو تو ایسے سہی..... میری بیوی کا رتبہ ناپسند ہو تو کھلم کھلا اظہار کر سکتی ہو کہ تمہارا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں۔'' اس کی آنکھیں بالکل ساکت مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

''آپ جی..... آپ کو.....'' وہ چپ ہو گئی۔

ہم دونوں تھڑی دیر خاموش بیٹھے رہے پھر میں نے گلے سے پھولوں کے سنہری تاروں والے روپے کے کئی ہار اتار کر اس کے پاس پلنگ پر رکھے۔ اپنی زری کی اچکن اتار دی عین صاف کی اور وہ سلیم شاہی جوتا جو صبح سے پاؤں دبا رہا تھا اتار دیا۔

''شکر ہے تمہارے ماں باپ ماڈرن نہیں ورنہ جہیز میں ڈبل بیڈ سے دیتے.....'' میں نے ہنس کر کہا..... ''اس صورت میں مشکل پیدا ہو سکتی تھی..... آرام سے سو جاؤ

جب میں آؤں گا تو یہاں اس پلنگ پر لیٹ رہوں گا۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں اس وقت؟"

"کوئی خاص جگہ نہیں..... بس ایسے ہی۔"

وہ گھبرا گئی۔

"آپ بھابھی صولت کو بتانے چلے ہیں؟..... ڈر کر اس نے سوال کیا۔"

"نہیں!"

"اگر آپ نے کسی سے ذکر کیا..... تو میں مر جاؤں گی۔"

مجھ میں عجیب قسم کی قوت آ گئی تھی..... میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔ روشن۔ ..... لیکن اگر جدے والا کسی وجہ سے نہ آ سکا..... اور بچے کی آمد ہو گئی تو..... تو تم اسے میرا بچہ ظاہر کرنا۔"

وہ میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن آنکھوں سے مسلسل آنسو بہنے کی وجہ سے مجھے اس کی آنکھوں دکھائی نہ دیتی تھیں۔

"وہ ضرور آئے گا..... ضرور آئے گا..... وہ ایسا نہیں ہے جیسا اماں سمجھتی ہیں۔"

میں روشن کے قریب ہو گیا اور آہستہ سے میں نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر کہا..... "انشا اللہ..... وہ ضرور آئے گا..... ہم دونوں دعا کریں گے۔"

یکدم روشن نے میرا ہاتھ پکڑ لیا بلبلا کر بولی..... "آپ کو بھی تو کچھ بتانا تھا مجھے ..... آپ کو بھی تو۔"

"ابھی اس کا وقت نہیں آیا روشن..... بتاؤں گا کسی روز۔"

جس وقت میں سیڑھیوں سے اترا سارا گھر خاموش تھا آنگین میں بریانی اور قورمے کی خوشبو تھی سب ٹوٹے ہوئے پھول بکھرے تھے برآمدے میں قالین پر ڈھولک کے ساتھ دو تین باکری لڑکیاں بے سدھ سوئی ہوئی تھیں ان کے پاس بھابھی کے دونوں تو ام بیٹے مسعود اور فرید گتھم گتھا بے سدھ پڑے تھے۔ اندر باہر بجلی

کے پنکھوں کی گھوکر جاگی ہوئی تھی۔ میں نے سیڑھیوں کے نیچے سے اپنا موٹر سائیکل دبے پاؤں باہر نکالا اور دور تک موٹر سائیکل کو پیدل چلاتا نکل گیا پھر یکدم اس پر سوار ہو کر میں نے ریس دی رات کے پچھلے پہر موٹر سائیکل کی آواز چنگھاڑ کر دور دور پھیل گئی یکدم مجھے یوں لگا جیسے دکھائی نہیں دے رہا میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا..... خدا جانے کب سے میرے آنسو بہہ رہے تھے۔

میں مال روڈ کی طرف سے جناح باغ میں داخل ہوا رات کے وقت منٹگمری ہال جنات کا محل لگ رہا تھا میں نے باغ میں جانے سے بہت پہلے موٹر سائیکل کا انجن بند کر دیا اور کینٹین کے قریب اسے پارک کرنے کے بعد میں بائیں جانب مڑ گیا کافور کا درخت تلے عجیب قسم کی خوشبو تھی۔ سارے باغ میں جھینگروں کی آواز اور جگنوؤں کی ٹمٹماہٹ تھی۔ باغ سے ایک خاص قسم کا خوف پھوٹ پھوٹ کر ساری طرف پھیل رہا تھا۔

میں چھتنکارے کا کافور کے سرخت تلے لیٹ گیا۔ ہوا میں موت کی خوشبو تھی۔ میرے معدے میں تیزاب پھنیٹا جا رہا تھا اور منہ کڑوے کھیرے کی مانند تھا میں کچھ بھی سوچنا نہ چاہتا تھا پھر بھی یادوں کی چیونٹیاں میرے جسم پر تیر رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ..... میرے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے اور مجھے لگا جیسے میری نکسیر بہہ رہی ہے۔

شادی سے چند دن پہلے مجھ میں دو خواہشیں آگاہی کے ساتھ ابھری تھیں۔ اب مجھ پر یہ حقیقت بھی کھل رہی تھی کہ انسان جب تک چاہے جانے کی رب بننے کی آرزو رکھتا ہے وہ کبھی آزار نہیں ہو سکتا۔۔ چاہا جانا اور آزار رہنا صلیب کے بازو ہیں جن پر آدمی مصلوب ہو جاتا ہے پہلی مرتبہ مجھے مہاتما بدھ کی سمجھ آئی کہ وہ کیوں خواہشات کو ختم کر کے اپنی مکتی چاہتا تھا جب تک انسان میں ہلکی سی خواہش بھی ہو وہ

تابع رہتا ہے خواہش کی وجہ سے قیدی ہوتا ہے کبھی حاکم نہیں ہوسکتا۔ خواہش سے آزادی کیونکر ممکن ہے؟

کیونکر کیسے؟

موت سے پہلے موت..... زندگی کے ساتھ زندگی کی نفی..... آخر نجات سے پہلے کلی فرار۔

نجات کی آرزو تک سے..... ہر مسلک سے ہر بت سے چھٹکارا حاصل کرنے ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان ہر قسم کے بت توڑ دے ہر مسلک سے آزاد ہو جائے۔ کسی ملت میں شامل نہ ہو۔ کسی ملک کا باشندہ نہ ہو..... کسی معاشرہ کا فرد نہ ہو کسی۔ کلچر سے وابستہ نہ ہو۔ کسی خاندان کا فرد نہ ہو..... نہ کسی کا عاشق ہو نہ محبوب..... ہر کیفیت سے آزاد..... ایسی حالت میں وہ سوائے موت کے اور کسی کا مرہون منت نہیں ہوگا کسی اور کا عاشق نہ ہوگا۔

موت جو یقینی ہے..... موت سے پہلے موت۔

کیا انسان پیدائش کے لمحے سے لے کر موت کی گھڑی تک صرف اسی کوشش میں رہتا ہے کہ وہ کسی طرح اس محسن کو پہچان سکے جو اسے زندگی کے ہر احسان سے نجات دلا سکتا ہے کبھی کبھی اچانک کسی کے چہرے پر خاموشی اور غم کی دبلیز لہریں چھا جاتی ہیں۔ کیا اس لمحے اسے مراجعت کی فکر ہوتی ہے کیا موت کا مہربان سایہ اس پر پڑتا ہے؟ کیا ابائی وطن کی طرف لوٹ جانے کی آرزو ہر ذی روح کو یہاں کی لذتوں میں بھینا آسودہ رکھتی ہے؟ کبھی کبھی بھری محفلوں میں شام کے وقت سب خاموش ہو جاتے ہیں کیونکہ موت کا فرشتہ وہاں سے گزرتا ہے اور سب کی سائیکی جانتی ہے کہ انسان موت کی مدد کے بغیر مکمل طور پر کبھی آزاد نہیں ہوسکتا خواہشات کا تمام بوجھ انسان کے کندھوں سے اتارنے والی صرف موت ہے۔

سیمی زندگی میں کتنی کرب ناک تھی..... وہ کیسے تلملاتی رہتی تھی اور موت سے

ہمکنار ہوتے ہی اس کا چہرہ کتنا شانت ..... کیسا آزاد ہو گیا۔

اس دن کے بعد میری زندگی کا ہر لمحہ موت کے متعلق سوچنے میں گزرنے لگا۔ موت کے ساتھ ہمکلامی کے بعد مجھ میں ایسا خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگ جاتا۔ مجھے گردوپیش کی سدھ بدھ نہ رہتی اور کئی بار ایک ہی پوزیشن میں کتنی کتنی دیر بیٹھا یا کھڑا رہتا مجھے لگتا تھا جیسے میں اسی لیے پیدا ہوا ہوں کہ موت کا منتظر ہوں۔ میں جیتے جی کسی عورت کے عشق کا سہارا لے کر آزاد نہیں ہو سکتا۔ خواہشات کے خوش رنگ اور عطر بیز جنگل سے اگر کوئی چیز مجھے نکال سکتی ہے تو وہ صرف موت ہے ..... اور اگر میں جسمانی طور پر نہ بھی مر سکوں تو بھی اندر مجھے مر ہی جانا چاہیے۔

اس وقت ایک گھنٹی جھاڑی سے ایک نوگزے آدمی برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کئی آدمی تھے۔ کسی کے سر پر بال نہ تھے اور چار ابروؤں کا بھی صفایا تھا ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی روشن مشعلیں تھیں اور وہ دائرے میں ایسے چل رہے تھے کہ نوگز آدمی درمیان میں آٹھ نمبر بناتا آگے بڑھتا اور باقی تمام بالشتے اس آٹھ کے گرد واٹر بال کی طرح گول گول چکر لگاتے آتے اس نوگزے کو میں ان دنوں بھی دیکھا تھا جب یہی موت سے ہمکنار تھی اس وقت مجھے یقین تھا کہ اب وہ میرے خیر مقدم کے لیے آیا ہے مشعلوں کی روشنیاں کبھی تابناک ہو جاتیں کبھی بھک سے جل کر واپس مشعلوں میں گھس جاتیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے بالشتے ساری مشعلیں چاٹ جاتے، اب وہ تمام کے تمام خود مشعلوں کی طرح بھڑک رہے تھے لیکن ختم نہ ہوتے تھے کبھی کبھی جگنو ساں بجھ جاتے لیکن پھر لحظہ دو لحظہ بعد ان کا دائرہ بھڑک اٹھتا نوگزے کو البتہ نہ ان کی فکر تھی نہ آگاہی وہ آٹھ کا ہندسہ بناتا دائرے میں آگے بڑھتا آ رہا تھا۔

اپنی طرف اسے بڑھتے دیکھ کر میں پسینے میں شرابور ہو گیا میں اٹھ کر بھاگنا چاہا۔

لیکن اس کی نظروں میں ایک مقناطیسی کشش تھی اس نے مجھے ایسے باندھ رکھا تھا جیسے سانپ کو بین مسحور کر لیتی ہے۔ اس کا سارا تن سفید چادر میں چھپا ہوا تھا یہ چادر نہ سلی ہوئی تھی نہ کھلی..... نہ جبے کی شکل کی تھی نہ تہمد جیسی بس ایک لبادہ تھا جیسے روئی میں نگندے ڈال کر پہنی ہوئی ہے وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا لیکن ہم دونوں میں عجیب طور پر بغیر بولے گفتگو جاری ہوگئی۔

''تم مجھ سے موت کے متعلق پوچھنا چاہتے ہو؟''

''ہاں..... ہاں..... میں جاننا چاہتا ہوں..... انسان کہاں سے آیا ہے اور کہاں چلا جائے گا..... وہ..... جہاں سے آیا ہے کیا وہیں لوٹے گا کہکہیں اور..... یہ سارا وقفہ..... یہ ساری دیوانگی..... اس سے چھٹکارا..... کیا موت سے پہلے نہیں ہو سکتا؟..... کیا آزاد ہونے کے لیے صرف اس سوئی کے ناکے سے گزرنا ہوگا؟''

وہ خاموش تھا اور میری طرف سرچ لائٹ جیسی نظریں جمائے ہوئے تھا۔

''بتاؤ تم بتا سکتے ہو.....؟ کیا موت کی آرزو نے انسان کو دیوانہ بنا رکھا ہے..... کیا ہر انسان شروع دن سے صرف موت کی آرزو کرتا ہے..... بولو بتاؤ..... کیا نسل انسانی صرف تصور موت کے ہاتھوں پاگل ہوتی ہے؟ بتاؤں ناں۔''

اس کی نظروں میں جلا دینے اور بھسم کرنے کی قوت تھی۔

میں دیر تک سوالا تکرتا رہا وہ دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا صرف اس کے اردگرد بالیشے روشنی کے گولے بناتے رہے۔

''بتاؤ..... بتاؤ موت کیا ہے؟ یہ اسرار یہ بھید کیا ہے..... فنا کا ذائقہ کیا ہے؟ مر کر آدمی پر کیا بیت جاتی ہے؟''

اس نے تین مرتبہ بغیر پلکوں کے پپوٹے جھپکائے اور بغیر آواز کے گویا ہوا۔ سن! جب انسن مرتا ہے تو دو آدمی مردے کے پاس آتے ہیں۔ غالباً ان ہی کو منکر نکیر کہا جاتا ہے ان دونوں کا مقصد تمہیں الجھانا ہوتا ہے..... ایک آدمی جھوٹا ہوتا ہے اور

ایک سچا..... جھوٹے کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں اس فریب میں مبتلا رکھے کہ تم زندہ ہو۔ اور ابھی تمہاری روح واپس جسد خاکی میں چلی جائے گی سچے آدمی کو یہ مشکل درپیش ہوتی ہے کہ کس طرح آپ کو یہ یقین دلائے کہ آپ مر چکے ہیں اور اب آپ کی روح جسد خاکی میں کبھی نہ جا سکے گی..... اس مرحلے میں تین دن لگتے ہیں۔"

"پھر..... پھر؟..... پھر؟"

"بڑی روو کد کے بعد انسان بالآخر سچے آدمی کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ وہ مر گیا ہے اب جھوٹا ساتھی رخصت ہو جاتا ہے اور سچا آدمی کئی سائز کے نیم شفاف ڈبے لے کر پہنچتا ہے..... یہ ڈبے بڑے ریفریجریٹر کے کھوکھلے سے لے کر دوائی کے کیپسول جتنے ہوتے ہیں ان سب کا رنگ پہلکا گلابی ہوتا ہے اب سچا آدمی مرے ہوئے آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان ڈبوں میں سے کسی کو منتخب کرے جس قدر بڑی روح ہو گی اسی جتنا بڑا ڈبہ تلاش کرنا پڑتا ہے کئی بار مرنے والا چھوٹا ہوتا ہے لیکن بڑے کھوکھے میں جا بیٹھتا ہے اور سچے آدمی کو منتوں سے منانا پڑتا ہے کہ وہ یہ کھوکھا چھوڑ دے۔ درست ڈبے کے انتخاب اور اس میں بند ہونے میں قریباً چالیس دن لگ جاتے ہیں لیکن ایک بار جب روح ڈبے میں بند ہو جاتی ہے تو پھر سچا آدمی جلدی سے ڈبہ لے کر رخصت ہو جاتا ہے۔"

"کہاں..... کہاں؟"

وہ نماموش رہا اس کی ٹکٹکی سے شعاعیں نکل رہی تھی۔

"دریائے نیستاں پر..... اس سریا میں سچا آدمی وہ سارے ڈبے پھینک دیتا ہے جن میں روحیں مقید ہوتی ہیں..... پھولے ہوئے تمام ڈبے اپنے اپنے بوجھ سے دریا کی تہہ میں اترنے لگتے ہیں اور ڈبوں میں روحیں بند روحیں باہر نکلنے کے لیے جدوجہد کرتی ہیں یہ ڈبے عجیب طرح سے بند ہوتے ہیں نہ کہیں زپ نہ بٹن..... نہ کنڈا..... صرف کسی ایک جنگی مناسب بوجھ پڑ جاتا ہے تو ڈبہ خود بخود کھل جاتا ہے کئی

لوگ سالوں میں قرنوں میں صدیوں میں یہ ڈبہ نہیں کھول سکتے کئی پہلے غوطے میں کچھ ایسے اطمینان سے بوجھ ڈالتے ہیں کہ کھٹاک سے ڈبے کا منہ کھل جاتا ہے اور روح تیر کر باہر نکلتی ہے۔اور کائی جمی سطح کو کاٹ کر باہر نکل جاتی ہے۔ان کے لیے نئی زندگی ہوتی ہے۔"

"کچھ ایسے بدنصیب بھی ہوں گے جو..... جو باہر نہیں نکل سکتے..... وہ لوگ وہ روحیں؟۔"

"ایسے بدنصیب نیچے سطح پر جا پہنچتے ہیں یہ روحوں کا قبرستان ہے..... یہ روحیں قیامت تک وہیں رہیں گی۔روز جزا تک..... یہ وہیں بند سیپیوں کی طرح منتظر رہیں گی کوشش کرتی رہیں گی لیکن باہر نہ نکل سکیں گی۔"

پتہ نہیں کیا بات ہوئی کہ میں کافور کے درخت تلے سے اٹھا اور بھاگنے لگا۔گول داؤروں میں..... کبھی گراؤنڈ کے اندر..... کبھی سڑکوں پر..... کبھی درختوں کے گرد..... کہتے ہیں کہ جب گدھ کی موت آتی ہے تو وہ مردار سے بھی منہ پھیر لیتا ہے پھر وہ ایک ٹانگ پر دور دور نزدیک بنجر علاقوں میں یوں بھاگتا ہے جیسے مدتوں کا پیاسا ہو مردار جانور کا تعفن اس کے نتھنوں میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ آتا رہتا ہے لیکن اس تعفن سے اشتہا بڑھنے کے بجائے اسے متلی ہونے لگتی ہے اس کے جسم میں مردار کھانے کے خلاف احتجاج ہونے لگتا ہے ایسے میں وہ گم ہیضے کا شکار ہو جاتا ہے اشتہا عروج کو پہنچ جاتی ہے لیکن جبڑے نہیں کھلتے معدہ کچھ قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے وہ بنجر زمین پر پڑے ہوئے مردار لاشوں کو دیکھ کر بھاگتا ہے اور آخر کو خاردار جھاڑیوں الجھ کر دم توڑ دیتا ہے مرے ہوئے گدھ کے لاشے کو ٹھکانے لگانے فطرت کے خاکروب نہیں آتے۔اس لاشے کو سورج کی کرنیں..... ریت کے سوکھے انبار، خشک پتے..... بارش اور ہوا کے تھپیڑے توڑ پھوڑ کر پھر مٹی کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

کہتے ہیں ایسی مٹی میں جو بھی بیج ڈالو..... کبھی بار آور نہیں ہوتا..... کبھی زمین

سے سر نکال ہی نہیں سکتا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں تھا!

کچھ دیر تک میں اپنے اردگرد کا صحیح جائزہ نہ لے سکا دھوپ بہت تھی ماحول نیا تھا میرے بازو میں گلوکوز کی ڈرپ لگی تھی اور سامنے کرسی پر روشن بھٹی تھی..... روشن سے کوئی یقینی تعارف نہ تھا شاید میں اسے پہچان ہی نہ سکتا..... اگر اس کے ساتھ دائیں بائیں بھائی مختار کے دونوں بچے کھڑے نہ ہوتے۔ بھابھی صولت میرے پائنتی بیٹھی تھیں اور منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔

''اب طبعیت کیسی ہے.....'' روشن نے سوال کرتے ہی نظریں جھکا لیں۔

''باتیں نہ کرو.....'' بھابھی صولت نے خفگی کے ساتھ کہا..... ''پتہ نہیں ڈاکٹر نے منع کیا ہے..... اسے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔''

''چچا جی آپ جناح باغ کیوں گئے تھے؟.....'' مسعود نے پوچھا۔

''آپ چڑیا گھر گئے تھے نا..... چاچا جی نیا زیبرا دیکھنے.....؟'' فرید نے سوال کیا۔

''چپ کرو..... اور باہر چلے جاؤ.....'' بھائی مختار نے جھڑکا۔

''آپ بیہوش کیوں پڑے تھے جناح باغ میں چاچا جی.....'' مسعود نے پھر پوچھا

''چلو نکلو یہاں سے جاؤ.....'' بھابھی صولت نے بچوں کو پانچ روپے کا نوٹ پکڑا کر کہا..... ''باہر جا کر آئس کریم کھاؤ۔''

میں نے آنکھیں بند کر لیں دن کی روشنی ہسپتال کا کمرہ، کمبل، ڈرپ، روشن کا چہرہ سب میرے لیے بے حقیقت چیزیں تھیں میں ابھی تک نوگزے کے ساتھ تھا اور میرے نتھنوں میں کافور کی خوشبو تھی۔ ڈاکٹر کے آنے تک میں دم سادھے آنکھیں

بند کیے لیٹے رہا روشن اور بھابھی صولت سے کوئی بات کرنے کو نہ تھی۔

''وہ کہاں ہے.....؟.....وہ.....''میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

بلڈ پریشر کا آلہ میرے بازو پر فٹ کرتے ہوئے ڈاکٹر نے تعجب سے میری جانب دیکھا اور بولا.....وہ کون حضرت!..... یہاں تو ہم سب ہیں آپ کی خدمت کے لیے۔

''وہ نوگزے کا آدمی.....جو مشعل لے کر چلتا تھا جو.....جس نے مجھ سے باتیں کی تھیں

ڈاکٹر بے معزز تھکا ہوا، عینکو، زمینی شخصیت کا آدمی تھا ڈاکٹری اس کا صرف پیشہ تھا.....وہ بناوٹی بے تکلفی اور خوش دلی سے بولا.....''حضور آپ تو پانچ دن سے بے ہوش پڑے ہیں خدا کا شکر کریں جان بچ گئی ورنہ بہت کچھ ہو سکتا تھا۔''

میں نے آنکھیں بند کر لیں مجھے معلوم تھا کہ وہ میری باتیں سمجھ نہیں سکتا۔

پھر بھابھی صولت اور ڈاکٹر کھسر پھسر کرنے لگے۔

''بے ہوش ہو گیا ہے پھر.....؟.....''

''بس آرام کی ضرورت ہے ہم Tranqulizers دے رہے ہیں''

''ابھی تو ٹھیک تھے'' روشن کی آواز آئی

''بس جی باڈر لائن کیفیت ہوتی ہے کبھی مریض ہمارے پاس واپس آجاتا ہے کبھی ادھر چلا جایا ہے ایب نارمل لوگوں میں''

''آپ ان کی مدد نہیں کر سکتے؟.....'' روشن نے سوال کیا۔

''کر رہے ہیں بی بی.....ہم سب کچھ کر رہے ہیں لیکن ایسا کیس ہمارا نہیں ہوتا۔ انہیں کسی سائیکو تھراپسٹ کی ضرورت ہے.....سردست جو کچھ بھی ممکن ہے کر رہے ہیں''

اس کے بعد کسی نے میرے بازو میں انجکشن لگایا بھابھی صولت کے رونے کی

آواز آئی اور رفتہ رفتہ مجھے یوں لگا جیسے میں کھسک رہا ہوں چارپائی سے بستر سے ..... میرا سر بوجھل تھا میں بازو اٹھا کر ناک کھجلانا چاہتا تھا آنکھیں کھول کر دیکھنے کی آرزو تھی۔ لیکن نہ میری آنکھیں کھلتی تھیں نہ بازو اٹھتا تھا۔

''یہ..... یہ ٹھیک تو ہو جائیں گے .....'' روشن کی آواز تھی اور اسی آواز کے ساتھ میں دوبارہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

ہسپتال سے واپسی پر سب سے پہلے میں نے اپنے سر کے سارے بال منڈا دیے سر منڈوانے سے میں نے وہ ڈیڈھ فٹ کا فاصلہ اور بڑھا لیا جو روشن اور میرے پلنگ کے درمیان تھا میں ابھی تک چھٹی پر تھا لیکن اب ریڈیو سٹیشن سے کبھی کبھی کوئی واقف میری طبعیت کا پوچھنے آجاتا۔ مجھے معلوم ہے کہ مریرے تعلق ریڈیو پر کیسی باتیں ہوتی ہوں گی۔ کچھ آرٹسٹ اور افسر مل کر مجھے دیوانہ سمجھتے ہوں گے شروع سے ..... نیچے بھابھی صولت اور بھائی مختار بھی مجھے دیکھ کر شرمندہ ہو جاتے ان کی شکلیں دیکھ کر مجھے لگتا جیسے وہ مجھے نہیں اپنے آپ کو قصوروار سمجھتے تھے ادھر روشن کی عجیب مصیبت تھی وہ دن بدن پیلی ہوتی چلی جا رہی تھی پہلے اس کی رنگت زرد ساٹن جیسی تھی اب وہ پیلے کھدر جیسی نظر آتی۔ میرا سارا کام وہ کرتی اس کی ضروریات کا میں خیال رکھتا اس کے باوجود ہم دونوں میں ہم ہی بات ہوتی۔ کمرے میں ترتیب آگئی تھی۔ یا تو میرے آنے سے پہلے وہ سو جاتی لیکن اگر وہ جاگتی نظر آتی تو میں نیچے چلا جاتا اور بے مصرف سڑکوں پر گھومتا رہتا۔ یہ عجیب دن تھے جیسے پانی کی سطح ہو ہولے ہولے کائی جمتی چلی جائے میرے اندر بھی ہر خواہش آہستہ آہستہ شٹر بند ہو رہی تھی اور میں عجیب طرح سے آزاد ہوتا چلا جا رہا تھا موت سے اس قدر گہرا رابطہ قائم کرنے کی وجہ سے زندگی یکدم بے معنی ہو گئی تھی ..... میں دوکانوں کے سامنے کھڑا سوچتا رہتا ..... لوگ یہ سارا سامان کیوں خریدتے ہیں کیمرے ..... کپڑے ..... قالین، برتن

.....گیس کا سامان .....فریج کاریں .....سارے بازاروں میں بے ہودہ سامان دیکھ کر میں جان بچا کر کسی فلم ہاؤس کے سامنے جا کھڑا ہو جاتا فلموں کے پوسٹر اب جاذب نظر نہ رہے تھے .....میں کوشش کرتا کہ ان فلموں میں مجھے دل چسپی پیدا ہو جائے لیکن جن وجوہات کی بناء پر فلمیں دیکھی جاتی ہیں وہ باقی نہ رہی تھیں۔

باغوں میں سڑکوں پر سب جگہ مجھے بے مصرف لوگ نظر آتے۔

یہ وہ دور تھا جب میں مکمل آزادی یا .....تمام تر فنا کے بالکل مقابل تھا۔

گھر پر میرا کوئی کام نہ تھا۔ روشن مجھے دبی زبان میں آرام کرنے کو کہتی۔ لیکن مجھے گھر سے وحشت ہوتی تھی۔ باہر چلا جاتا تو بھی کوئی کام میرے کانے کا نہ تھا۔ میں فٹ بال کی طرح کبھی اس کورٹ میں کبھی اس کورٹ میں بھاگتا رہتا ایک صبح مجھے روشن نے کہا ..... ''اگر آپ چاہیں تو میں موچی چلی جاؤں اماں کے پاس .....''

''تمہاری مرضی ہے۔''

''آپ بتائیں۔؟''

''میں کیا بتاؤں اگر تم کو یہاں آرام ہے تو یہاں رہو ورنہ وہاں چلی جاؤ۔''

وہ رونے لگی۔

'' آرام تو مجھے یہاں زیادہ ہے لیکن .....لیکن میری وجہ سے آپ کو آرام نہیں ہے۔''

میں اس کے مقابل پلنگ پر بیٹھ گیا ..... ''دیکھو روشن تمہاری وجہ سے مجھے کوئی تکلیف نہیں اس وجہ سے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

ہم دونوں چپ ہو گئے۔

''اس کا کیا جواب آیا ہے؟۔''

روشن اٹھی اور نئے سوٹ کیس کی جیب میں سے یو اے ای کی ٹکٹ والا لفافہ نکال لائی۔

یہ خط اس کا تھا۔روشن کے افتخار کا۔

''کیا لکھا ہے۔؟''

''آپ پڑھ لیں۔''

میں نے بڑی دیر میں خط پڑھا..... پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں میں جالے سے آرہے تھے تحریر معمولی تھی۔پتنگ فروش کے بیٹے کی سیدھی سادی تحریر۔لیکن تحریر میں حدت خلوص محبت سب کچھ تھا اس نے اصرار سے لکھا تھا کہ جتنی جلدی میں اسے آزاد کردوں گا۔وہ آجائے گا اور پھر دونوں واپس جاسکیں گے۔

''تم اسے لکھو کہ تم آزاد ہو اور ہم اس کا انتظار کررہے ہیں۔''

''سب کچھ جلدی ہونا چاہیے..... میں..... میری حالت زیادہ انتظار نہیں کرسکتی۔''

''یہ تو افتخار پر منحصر ہے جتنی جلدی وہ آجائے گا معاملہ طے ہوجائے گا۔''

وہ چپ ہوگئی..... بڑی دیر چپ رہی۔

''میں جی پھر چلی جاؤں موچی دروازے۔''

''جیسا تمہارا جی چاہتا ہے روشن..... میں..... تمہاری زندگی میں کسی قسم کے فیصلے نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ اٹھی اور میرے پاس آکر بیٹھ گئی اس کے عورت پن کی خوشبو میرے اس قدر قریب تھی کہ میں اس خوشبو کی وجہ سے ہی اپنے فیصلے بدل سکتا تھا۔

''آپ قانونی طور پر میرے شوہر ہیں آپ کا حق ہے میرے فیصلے بدلنے کا۔''

میں اٹھ کر سلاخوں والی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔پھر میں زور سے کھانسا اور تھوک دور پھینک کر عجیب لذت محسوس کی۔

''دیکھو اگر تمہارے خط آسانی سے موچی دروازے آسکتے ہیں تو وہی جگہ اچھی ہے..... ورنہ.....''

''میں پھوپھی جان کے جاسکتی ہوں گلبرگ میں وہ .....وہ ماڈرن ہیں اور .....افتخار کو پسند کرتی ہیں۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔''

شام کو میں روشن کو لے کر پھوپھی جان کے گھر پہنچا وہاں روشن اور میرے لیے ڈبل بیڈ والا کمرہ مخصوص تھا اس ڈبل بیڈ کو دیکھ کر میں بدکے ہوئے گھڑے کی طرح باہر کو بھاگا۔ میں روشن سے مل کر بھی نہ آیا۔ بلکہ پھوپھی جان پینٹری میں ٹرولی سجاتی وہ گئیں اور میں باہر نکل گیا۔ عین کوٹھی کے باہر جس وقت میں موٹر سائیکل موڑنے کی کوشش میں تھا ایک لمبی سفید کار رکی اور ہارن بجا۔ گو میں حاضر نہیں تھا۔ پھر بھی وہیل پر دونوں بازو رکھنے والا مجھے جانا پہچانا نظر آیا۔

''سہیل!.....سر۔''

پروفیسر نے دروازہ کھولا میں نے موٹر سائیکل چھوڑی اور پھر ہم دونوں شدت سے بغل گیر ہو گئے۔

سہیل نے فرنچ کٹ داڑھی اور موٹے شیشوں کی ڈگ عینک پہن رکھی تھی اس کے جسم پر سرخ چیک کی قمیض تھی جس کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں اور قمیض کے تین بٹن کھلے تھے اس کی جینز موری بند تھی اور کلائی پر ڈیجٹل گھڑی تھی۔ جس کا سیکنڈ کا پھول ہر سیکنڈ کے بعد بدلتا جاتا تھا وہ سارا کا سارا تمباکو کولون اور آفٹر شیو لوشن سے مہکا ہوا تھا۔

''یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے کوجیک؟.....''اس نے امریکہ کے مشہور گنجے ایکٹر کے نام سے مجھے پکارا۔

''بس ایسے ہی؟.....سر۔''

یہاں کہاں پھر رہے ہو میری چچی کے گھر۔؟

''اپنی بیوی جمع کروانے آیا تھا۔''